INTERNATIONAL PREMIER JOURNAL OF LANGUAGES & LITERATURE (IPJLL)
VOLUME 4, ISSUE 3, 2026 p-ISSN: 3007-2336 e-ISSN: 3007-2344

"سلیوٹ" کی نوتاریخی پڑھت
(NEW HISTORICAL STUDY OF 'SALUTE')

ڈاکٹر شہباز حسین
پاک سیکرٹریٹ، اسلام آباد
shahbazqadri0011@gmail.com

Abstract

This article offers a New Historicist reading of *Salute*, the autobiography of Siddiq Salik, a distinguished Urdu prose writer and army officer. While the text presents itself as a personal narrative, it also functions as a military memoir shaped by Salik's patriotic commitment, institutional location, and historical experience. The study argues that *Salute* cannot be read merely as an objective record of events; rather, it reflects the ideological, political, and professional pressures that influenced the author's perspective and narrative choices. Through selected episodes, such as the sentencing of Maulana Maududi, the anti-Ayub protests of 1969, the transfer of power to General Yahya Khan, and the crisis of East Pakistan - the article demonstrates how Salik's account reveals both historical realities and the silences, biases, and institutional constraints embedded within them. His observations on the alienation of East Pakistanis especially highlight how social behavior, bureaucratic arrogance, and military attitudes contributed to political rupture. By applying New Historicism, the article uncovers the interaction of text, power, ideology, and history in *Salute*, showing that autobiographical writing is deeply shaped by its age. Thus, *Salute* emerges as both a literary and an historical document of considerable interpretive value.

Keywords: *Autobiography, East Pakistan, Historical Narrative, Military Memoir, New Historicism, Political Discourse, Power Structures, Salute, Siddiq Salik, Urdu Prose.*

Corresponding Author: ڈاکٹر شہباز حسین (پاک سیکرٹریٹ، اسلام آباد)
Email: shahbazqadri0011@gmail.com

"سلیوٹ" ممتاز نثر نگار اور فوجی افسر صدیق سالک کی آپ بیتی ہے۔ صدیق سالک کا شمار اردو ادب کے نامور اور قد آور ادیبوں میں ہوتا ہے۔ بنیادی طور پر ایک فوجی افسر تھے اور ہر فوجی کی طرح ایک محبِ وطن تھے۔ یہی جذبہ ان کی شخصیت اور تحریروں میں بھی نمایاں طور پر جھلکتا نظر آتا ہے اور ان کی تخلیقات کے ہر صفحے پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ادبی اعتبار سے بھی صدیق سالک ایک وسیع الجہات اور ہمہ جہت نثر نگار تھے۔ انہوں نے اردو ادب کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی اور ہر صنف میں اپنی انفرادیت کا لوہا منوایا۔ ان کی تخلیقات میں آپ بیتی کے علاوہ مزاح نگاری، ناول نگاری، رپورتاژ نگاری اور تاریخ نویسی کے دل چسپ اور معیاری نمونے ملتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں مشاہدے کی گہرائی، حقیقت نگاری اور دل کش اسلوب نمایاں نظر آتا ہے، جو قاری کو اپنی طرف متوجہ رکھتا ہے۔ وہ صرف اردو ہی نہیں بلکہ انگریزی زبان میں بھی لکھتے رہے اور دونوں زبانوں میں اپنی ادبی صلاحیتوں کا اظہار کیا۔ ان کی یہ ہمہ جہتی صلاحیت انہیں اردو ادب کے نمایاں اور قابلِ احترام ادیبوں کی صف میں ممتاز مقام عطا کرتی ہے۔

"سلیوٹ" پہلی دفعہ 1988ء میں شائع ہوئی۔ اپنی اہمیت اور مقبولیت کے باعث اب تک اس کے تیرہ ایڈیشن منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔ اس کتاب کا انتساب "پاک فوج کے شہیدوں کے نام" کیا گیا ہے جو مصنف کے وطن سے گہرے تعلق اور افواجِ پاکستان سے محبت کی عکاسی کرتا ہے۔ یہ کتاب محض ایک سوانح عمری نہیں بلکہ مصنف کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی ایک بھرپور اور حقیقت پسندانہ تصویر پیش کرتی ہے، جس میں صدیق سالک نے اپنے خاندانی پس منظر، تعلیمی سفر، معاشی حالات اور معاشرتی تجربات کے ساتھ ساتھ اپنی عسکری زندگی کی یادگار روایات اور واقعات کو بھی بڑی دل چسپی سے بیان کیا ہے۔ تاہم اس میں صدیق سالک کی نجی و خاندانی زندگی کی نسبت عسکری زندگی کے واقعات اور مشاہدات زیادہ نمایاں نظر آتے ہیں، جس کی بدولت یہ بعض اوقات قاری کو ایک خود نوشت سوانح عمری سے زیادہ "عسکری نامہ" بھی لگنے لگتی ہے۔ "سلیوٹ" میں اگرچہ عسکری زندگی کے واقعات اور تجربات کا بیان زیادہ نمایاں نظر آتا ہے، تاہم مصنف نے اپنے عہد کے سیاسی حالات و واقعات پر بھی نہایت سنجیدگی اور تفصیل کے ساتھ قلم اٹھایا ہے۔ بالخصوص سانحۂ مشرقی پاکستان اور اس سے متعلقہ واقعات کا ذکر اس کتاب میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ صدیق سالک اس جنگ کے محض مبصر نہیں تھے بلکہ ایک فوجی افسر کی حیثیت سے اس میں عملی طور پر شریک بھی رہے۔ جنگ کے دوران پیش آنے والے حالات اور اس کے بعد سقوطِ ڈھاکا کے نتیجے میں وہ بھارتی افواج کے قیدی بھی بنے۔ اسی بنا پر انہیں ان واقعات کو قریب سے دیکھنے اور محسوس کرنے کا موقع ملا، جس کے باعث ان کی بیان کردہ روایات ایک عینی شاہد کی گواہی کا درجہ اختیار کر لیتی ہیں۔ اسی حوالے سے جنرل کے۔ ایم عارف لکھتے ہیں:

> "صدیق سالک بیک وقت فوجی بھی تھے اور ادیب بھی۔ یہ دو آتشہ محبت انوکھی تو نہیں مگر کٹھن ضرور ہے۔ انھوں نے دونوں سے اپنا عہد استقامت اور تمکنت سے نبھایا۔ ان کی تحریر کے اسلوب میں بھی اظہار کے دو آبشار پہلو بہ پہلو رواں نظر آتے ہیں۔ ظرافت کے حوالے سے مسکراہٹوں کی پھلجھڑیاں اور کرب واندوہ کے ناطے سے آنسوؤں کی پھوار۔ سلیوٹ میں بھی ان کے یہ بنیادی جذبے، اپنے اپنے مقام پر کروٹیں لیتے دکھائی دیتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ایک بھرپور عسکری زندگی کا یہ رنگ، دل کش اور سچا مرقع اردو کے سوانحی ادب میں ایک جیالے اضافے کا باعث ہوگا"۔(۱)

مصنف نے اپنی اس آپ بیتی میں دورانِ جنگ اور ایامِ قید کے حالات و واقعات کو بڑی حد تک سچائی اور دیانت داری کے ساتھ بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے اندازِ بیان میں سادگی، بے تکلفی اور حقیقت نگاری نمایاں ہے، جس کے ذریعے وہ قاری کو اس دور کے حالات سے آگاہ کرتے ہیں۔ تاہم بعض مقامات پر یہ محسوس ہوتا ہے کہ مصنف کی ذاتی پسند و ناپسند، اور ایک فوجی افسر کی حیثیت سے ان پر عائد پیشہ ورانہ حدود و قیود، واقعات کے بیان پر اثر انداز ہو جاتی ہیں۔ یوں کہیں کہیں واقعات کی تعبیر اور پیش کش میں ایسی جھلک دکھائی دیتی ہے جو مکمل غیر جانب داری پر سوال اٹھا سکتی ہے۔ چنانچہ بعض بیانات ایسے محسوس ہوتے ہیں کہ گویا وہ مصنف کی ذاتی وابستگیوں یا ادارہ جاتی تقاضوں کے زیرِ اثر بیان ہوئے ہوں، جس سے تاریخی حقائق کے بیانیے میں ایک حد تک ابہام پیدا ہو جاتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں نوتاریخی تنقید (New Historicism) کی اہمیت سامنے آتی ہے۔ نوتاریخی نقطۂ نظر ان متون کا از سرِ نو مطالعہ کرتے ہوئے ان پہلوؤں کو نمایاں کرتا ہے جو بسا اوقات متن میں پوشیدہ رہ جاتے ہیں یا جنہیں شعوری یا غیر شعوری طور پر پس منظر میں رکھا جاتا ہے۔ اس طرح یہ طرزِ مطالعہ متن کے اندر موجود چھپے ہوئے سچ اور غیر مرئی پہلوؤں کو سامنے لانے کی کوشش کرتا ہے اور تاریخی واقعات کے اصل تناظر اور حقیقی صورتِ حال کو سمجھنے میں مدد فراہم کرتا ہے۔

نوتاریخیت (New Historicism) کے مطابق تاریخ محض واقعات کی غیر جانبدارانہ اور قطعی تصویر نہیں ہوتی بلکہ اسے لکھنے والا مورخ یا ادیب اپنے عہد کے فکری، سماجی اور سیاسی ماحول سے گہرے طور پر متاثر ہوتا ہے۔ جب کوئی مؤرخ تاریخ رقم کرتا ہے یا کوئی ادیب اپنا فن پارہ تخلیق کرتا ہے تو وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنے زمانے کے سیاسی دباؤ، مذہبی و نیم مذہبی عقائد، سماجی اقدار، خاندانی روایات اور پیشہ ورانہ وابستگیوں کے زیرِ اثر ہوتا ہے۔ یہ عوامل اس کے زاویۂ نظر، طرزِ فکر اور اسلوبِ بیان کو متاثر کرتے ہیں، جس کے نتیجے میں بعض اوقات تاریخی حقائق اپنی اصل اور مکمل صورت میں سامنے نہیں آ پاتے اور پسِ پردہ چلے جاتے ہیں۔ بقول پروفیسر عتیق:

> "نوتاریخیت ادیب کی زندگی اور دوسرے لفظوں میں اس کی ذہنی زندگی پر دباؤ ڈالنے والے اداروں اور صیغہ ہائے اختیار کا پتہ لگاتی ہے۔ جو طاقت کے طور پر اس کی تحریر پر اثر انداز ہوتے ہیں، مثلاً خاندانی روایت، مذہبی اور نیم مذہبی عقائد اور رسوم، حکومتِ وقت کے سخت گیر رویے وغیرہ۔ یہ تمام قوتیں ایک دوسرے کی طاقت میں اضافہ کرتی ہیں"۔(۲)

نوتاریخی تنقید کا بنیادی مؤقف یہی ہے کہ کسی بھی متن یا تاریخی بیانیے کو اس کے عصری، سماجی اور تہذیبی تناظر سے الگ کر کے نہیں سمجھا جا سکتا۔ ادیب یا مورخ اپنے معاشرے اور اپنے عہد کی طاقتور فکری و ادارہ جاتی قوتوں سے کسی نہ کسی درجے میں متاثر ہوتا ہے۔ یہی اثرات اس کی تحریر میں بعض واقعات کو نمایاں اور بعض کو پس منظر میں دھکیل دیتے ہیں، یا کبھی کسی واقعے کی تعبیر اس انداز میں پیش کی جاتی ہے کہ حقیقت کا پورا چہرہ سامنے نہیں آ پاتا۔ یوں تاریخ کے بعض پہلو غیر شعوری طور پر مسخ، محدود یا ادھورے رہ جاتے ہیں اور کئی سچائیاں پردۂ خفا میں چلی جاتی ہیں۔ چنانچہ نوتاریخی مطالعہ ایسے متون کو محض ایک ذاتی یا تاریخی بیان کے طور پر نہیں بلکہ عہد، طاقت، نظریات اور سماجی دباؤ کے باہمی تعلق کے تناظر میں دیکھتا ہے۔

اس زاویۂ نظر سے "سلیوٹ" کا مطالعہ نہ صرف مصنف کی زندگی اور تجربات سے آگاہ کرتا ہے بلکہ اس دور کے سیاسی، سماجی اور ادارہ جاتی اثرات کو بھی سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ یہی پہلو اس کتاب کے نوتاریخی مطالعے کو مزید اہم، معنی خیز اور قابلِ توجہ بنا دیتا ہے اور یہ آشکار ہوتا ہے کہ اس آپ بیتی میں کئی ایسے خلا موجود

ہیں جہاں مصنف کی وابستگیاں اور ادارہ جاتی تقاضے ان کے بیانیے پر اثر انداز ہوتے نظر آتے ہیں۔ اگرچہ انہوں نے واقعات کو دیانت داری کے ساتھ بیان کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے، تاہم بعض جگہوں پر ان کے پیشہ ورانہ تقاضے یا ذاتی رجحانات واقعات کی تعبیر کو متاثر کر دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کچھ واقعات یا پہلو مکمل وضاحت کے ساتھ سامنے نہیں آتے یا ان کی پیش کش میں ایک خاص زاویۂ نظر غالب دکھائی دیتا ہے۔

صدیق سالک نے اپنی آپ بیتی میں اپنے عہد کے بعض اہم اور حساس تاریخی واقعات کا بھی ذکر کیا ہے۔ انہی میں سے ایک واقعہ اس وقت کی معروف مذہبی و فکری شخصیت اور جماعتِ اسلامی کے امیر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کو مارشل لا کے دور میں ملٹری کورٹ کی جانب سے سنائی جانے والی سزائے موت کا ہے۔ مصنف نے اس واقعے کو بیان کرتے ہوئے نہ صرف اس وقت کے سیاسی و عسکری ماحول کی جھلک پیش کی ہے بلکہ اس کے پس منظر میں کارفرما ذہنی رویّوں اور ادارہ جاتی سوچ کو بھی طنزیہ انداز میں اجاگر کیا ہے۔ اسی واقعے کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "1952ء کے مارشل لا سپیشل ملٹری کورٹ نے جماعتِ اسلامی کے امیر مولانا ابوالاعلیٰ کو سزائے موت سنادی تھی اور اگلے روز تمام اخبارات میں یہی شہ سرخی تھی، اس پر انھوں نے خوش ہو کر فرمایا تھا کہ "دیکھو نا، اب بات بنی، کیسا عمدہ ڈسپلے ملا ہے پریس ریلیز کو"۔(۳)

صدیق سالک کے بیان کے مطابق جب مولانا مودودی کو سزائے موت دیے جانے کی خبر اخبارات میں نمایاں طور پر شائع ہوئی تو اس پر فوجی حلقوں میں مختلف قسم کے ردِّ عمل دیکھنے میں آئے۔ مصنف اپنے ایک ایسے سینئر افسر کے تاثرات کو طنزیہ پیرائے میں بیان کرتے ہیں جو اس ملٹری کورٹ کا حصہ رہے تھے۔ مذکورہ افسر اس بات پر نہایت مسرور دکھائی دیتے ہیں کہ مولانا کو پھانسی کی سزا دینے کی خبر قومی اخبارات کے پہلے صفحے پر نمایاں انداز میں شائع ہوئی ہے اور اس اقدام کو ایک بڑی کامیابی کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے۔ مزید برآں، انہیں اس بات کی بھی خوشی تھی کہ ان کے اعلیٰ افسران جب یہ خبر پڑھیں گے تو وہ اس کارروائی کو مارشل لا کی ملٹری کورٹ کا ایک ''اہم کارنامہ'' تصور کریں گے۔ اس واقعے کو نوتاریخی تناظر میں دیکھا جائے تو یہ محض ایک فرد یا ایک ادارے کے ردِّ عمل کی تصویر پیش نہیں کرتا، بلکہ اس دور کے طاقت کے ڈھانچوں، سیاسی فضا اور ریاستی بیانیے کی عکاسی بھی کرتا ہے۔ نوتاریخیت کے مطابق کسی بھی متن میں بیان ہونے والے واقعات دراصل اس عہد کے طاقتور اداروں، نظریات اور سماجی دباؤ کے زیرِ اثر تشکیل پاتے ہیں۔ چنانچہ صدیق سالک کا یہ بیان اس دور کی عسکری اور سیاسی فضا کو سمجھنے میں ایک اہم حوالہ فراہم کرتا ہے، جہاں ریاستی اختیار، ادارہ جاتی سوچ اور فرد کے ذاتی احساسات ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔

نوتاریخی نقطۂ نظر کے مطابق کسی بھی تاریخی واقعے یا متن کو اس کے سیاسی، سماجی اور ادارہ جاتی پس منظر کے ساتھ سمجھنا ضروری ہوتا ہے، کیونکہ ادیب یا مؤرخ اپنے عہد کے حالات اور طاقت کے ڈھانچوں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مصنف نے اپنی آپ بیتی میں جنرل ایوب خان کے مارشل لا کے خلاف پیدا ہونے والے عوامی اور سیاسی ردِ عمل کو بیان کرتے ہوئے اسی دور کی سیاسی کشمکش اور طاقت کی جدوجہد کو خوب نمایاں کیا ہے اور عوامی ردِ عمل پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ اسی صورتِ حال کو بیان کرتے ہوئے مارشل لا کے خلاف سیاسی اور عوامی ردِ عمل کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"فروری/مارچ 1969ء پاکستان میں شدید احتجاج اور گھیراؤ جلاؤ کے مہینے تھے۔ صدر مملکت اپوزیشن سے مذاکرات پر رضامند ہو گئے تھے اور نتیجتاً گول میز کانفرنس منعقد ہوگئی تھی"۔(۴)

مصنف کے مطابق 1969ء کے اوائل میں ملک بھر میں احتجاج، جلوسوں اور گھیراؤ جلاؤ کی فضا قائم تھی اور شدید عوامی و سیاسی ردِ عمل سامنے آرہا تھا۔ نوتاریخیت کی روشنی میں دیکھا جائے تو عیاں ہوتا ہے کہ ملک بھر میں برپا ہونے والے یہ احتجاج، جلسے جلوس، ہڑتالوں اور گھیراؤ جلاؤ کے واقعات محض سیاسی بے چینی کی سطحی علامت نہیں تھے، بلکہ یہ اس عہد کے اقتداری ڈھانچے، عوامی محرومی، ریاستی جبر اور سیاسی مزاحمت کے باہمی تصادم کا نتیجہ تھے۔ ریاست کا سرکاری بیانیہ کم زور پڑ رہا تھا اور عوامی ردِّ عمل ایک فیصلہ کن تاریخی قوت بن کر سامنے آرہا تھا۔ "سلیوٹ" میں اس احتجاجی فضا کا بیان اس لیے بھی اہمیت کا حامل ہے کہ یہ ہمیں سرکاری تاریخ کے ساتھ ساتھ عوامی بے چینی اور سیاسی دباؤ کی وہ پرتیں بھی دکھاتا ہے جو کسی بھی آمریت کے زوال میں بنیادی کردار ادا کرتی ہیں۔ اس روشنی میں جنرل ایوب خان کا اقتدار چھوڑنا محض ایک سیاسی فیصلہ نہیں بلکہ عوامی مزاحمت کے سامنے ریاستی اختیار کے کم زور پڑ جانے کی علامت بن جاتا ہے۔ یوں صدیق سالک کا بیانیہ نوتاریخی مطالعے کے لیے اس اعتبار سے اہم ہو جاتا ہے کہ وہ ایک بڑے تاریخی موڑ کو طاقت اور عوام کے تصادم کے تناظر میں سمجھنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔

نوتاریخی نقطۂ نظر کے مطابق یہی وہ مقام ہے جہاں متن محض واقعات کا بیان نہیں رہتا بلکہ اپنے زمانے کی طاقت، مزاحمت اور نظریاتی کشمکش کا آئینہ بن جاتا ہے۔ اس تناظر میں جنرل ایوب خان کے خلاف ابھرنے والی عوامی تحریک کو صرف چند سیاسی جماعتوں کی سرگرمی یا وقتی ہنگامہ آرائی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہ دراصل طویل آمریت، سیاسی گھٹن، معاشی ناہمواری، مشرقی و مغربی پاکستان کے درمیان بڑھتی ہوئی خلیج، اور عوامی حقوق کی مسلسل پامالی کے خلاف ایک بھرپور اجتماعی ردِّ عمل تھا۔ مصنف کے بیان سے واضح ہوتا ہے کہ حالات اس نہج پر پہنچ چکے تھے جہاں اقتدار کی رسمی ہیبت برقرار رکھنا ممکن نہ رہا تھا۔ چنانچہ نوتاریخی مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ ایوبی عہد کا زوال کسی ایک واقعے کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ مختلف سیاسی، سماجی اور عوامی عوامل ایک دوسرے میں مدغم ہو کر اس تاریخی تبدیلی کا سبب بنے۔ نوتاریخیت یہ بھی بتاتی ہے کہ تاریخ کو صرف حکم رانوں کے فیصلوں سے نہیں بلکہ عوام، سیاسی قوتوں، ریاستی اداروں اور متن میں پوشیدہ زاویہ ہائے نظر سے بھی پڑھنا چاہیے۔

صدیق سالک لکھتے ہیں کہ اس سیاسی ہلچل میں مشرقی پاکستان کے رہنما مولانا عبدالحمید بھاشانی اور مغربی پاکستان کے رہنما ذوالفقار علی بھٹو کا کردار نمایاں نظر آتا ہے، جنہوں نے گول میز کانفرنس میں شرکت کے بجائے عوامی تحریک اور احتجاج کو ترجیح دی:

صدر مملکت اپوزیشن سے مذاکرات پر رضامند ہو گئے تھے اور نتیجتاً گول میز کانفرنس منعقد ہوگئی تھی لیکن مشرقی پاکستان سے مولانا عبدالحمید بھاشانی اور مغربی پاکستان سے ذوالفقار علی بھٹو اس کانفرنس کو گول کر گئے تھے۔ وہ مذاکرات کی میز پر آنے کی بجائے بالترتیب گھیراؤ جلاؤ اور جلسے جلوسوں کو ترجیح دیتے تھے"۔(۵)

نوتاریخی تناظر میں صدیق سالک کا یہ اقتباس اس حقیقت کو نمایاں کرتا ہے کہ اس دور کی سیاست محض مذاکرات یا رسمی سیاسی عمل تک محدود نہیں تھی، بلکہ یہ ریاستی اقتدار اور عوامی مزاحمت کے درمیان ایک شدید کشمکش کا منظر نامہ تھی۔ مولانا عبدالحمید بھاشانی اور ذوالفقار علی بھٹو کا گول میز کانفرنس میں شرکت کے بجائے احتجاجی سیاست کو ترجیح دینا اس بات کی علامت ہے کہ اُس دور میں اصل سیاسی قوت عوامی دباؤ، جلسے جلوسوں اور سڑکوں کی تحریک میں سمجھی جا رہی تھی۔ صدیق سالک نے اگرچہ اس طرزِ عمل کو کسی حد تک تنقیدی انداز میں بیان کیا ہے، تاہم نوتاریخی مطالعہ بتاتا ہے کہ ان کا یہ بیانیہ بھی ان کی فوجی اور ادارہ جاتی وابستگی سے متاثر ہے۔ اس طرح یہ اقتباس نہ صرف اُس دور کے سیاسی بحران کو آشکار کرتا ہے بلکہ یہ بھی واضح کرتا ہے کہ تاریخ مختلف قوتوں، نظریات اور مفادات کے باہمی تصادم سے تشکیل پاتی ہے۔

جب عوامی و سیاسی مخالفت اپنی بھرپور شدت پر پہنچ گئی اور جنرل ایوب خاں کے لیے مسندِ اقتدار پر مزید براجمان رہنا ممکن نہ رہا تو انہوں نے راہِ فرار اختیار کرنے میں ہی عافیت جانی۔ مگر جنرل ایوب خاں نے اقتدار کو آئینی تقاضوں کے مطابق قومی اسمبلی کے اسپیکر یا انتخابات کے ذریعے منتخب قیادت کو منتقل کرنے کے بجائے اپنے ہم مرتبہ اور منظورِ نظر جنرل یحییٰ خان کے سپرد کر دیا۔ یوں پاکستان ایک دلدل سے نکل کر دوسری دلدل میں جا پھنسا اور ایک نئے سیاسی بحران سے دوچار ہو گیا:

> "بالآخر 25 مارچ 1969ء کی شام کو بلی تھیلے سے باہر آ گئی اور صدر مملکت ایک عدد الوداعی نشری تقریر کر کے اقتدار سے دستبردار ہو گئے۔ جاتے جاتے انھوں نے اپنے ہی تعنیات کردہ کمانڈر انچیف جنرل آغا محمد یحیٰی خاں کو چٹھی لکھ دی کہ آپ اپنی "آئینی ذمہ داریاں" پوری کریں۔۔۔ سچ پوچھئے تو اس وقت مجھے ہرگز علم نہ تھا کہ ایسی صورتِ حال میں فوج کی آئینی ذمہ داری کیا ہوتی ہے کیوں کہ آئین میں تو لکھا تھا کہ ایسی صورت میں اقتدار قومی اسمبلی کے سپیکر کو منتقل کیا جائے گا"۔(۶)

اس پر مستزاد یہ کہ جنرل ایوب خاں نے اپنے اس اقدام کو مارشل لا قوانین اور نام نہاد "آئینی ذمہ داریوں" کی بجاآوری کے پردے میں پیش کیا۔ صدیق سالک اس صورتِ حال کو نہایت طنزیہ انداز میں بیان کرتے ہوئے اس اصطلاح کو ایک سیاسی تمسخر کے طور پر استعمال کرتے ہیں، کیونکہ حقیقت میں یہ عمل آئینِ پاکستان اور جمہوری اصولوں کے سراسر منافی تھا۔ بقول صدیق سالک، جنرل یحیٰی خاں نے کچھ اس حالت میں اس ملک کی باگ ڈور سنبھالی:

> "جنرل یحیٰی خاں نے شراب پی کر اسلامی جمہوریہ پاکستان کے باشندوں کے نام اپنی تقریر ریکارڈ کروائی، تقریر انگریزی میں تھی۔ تقریر میں باقی مسالہ تو وہی تھا جو ایسے موقعوں پر ہوتا ہے۔ یوں برستی بارش میں شراب سے شرابور کمانڈر انچیف نے اپنی آئینی ذمہ داریاں پوری کر دیں اور میں نے مارشل لا لگنے کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ اگلے روز تقریر نشر ہو گئی اور ملک دوسری بار مارشل لا"۔(۷)

چنانچہ 25 مارچ 1969ء کو پورے ملک، یعنی مغربی اور مشرقی پاکستان دونوں میں دوسرا مارشل لا نافذ کر دیا گیا۔ 1962ء کا آئین منسوخ کر دیا گیا، قومی اور صوبائی اسمبلیاں تحلیل کر دی گئیں اور سیاسی سرگرمیوں پر مکمل پابندی عائد کر دی گئی۔ نوتار یخی تناظر میں دیکھا جائے تو یہ واقعہ صرف اقتدار کی منتقلی نہیں بلکہ اس عہد میں ریاستی طاقت، عسکری اداروں اور سیاسی بیانیے کے باہمی تعلق کی عکاسی کرتا ہے، جہاں آئین اور جمہوری اقدار کو پسِ پشت ڈال کر طاقت کے ڈھانچے نے اپنا تسلسل برقرار رکھا۔ صدیق سالک کی طنزیہ اور حقیقت پسندانہ تحریر اس دور کی اسی پیچیدہ سیاسی فضا کو بے نقاب کرتی ہے اور قاری کو اس زمانے کے پوشیدہ حقائق پر غور کرنے کی دعوت دیتی ہے۔

نوتار یخی نقطۂ نظر کے مطابق ''سلیوٹ'' میں بیان کردہ سیاسی و عسکری منظر نامے اور مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے پس منظر کو سمجھنا صرف واقعات کی تار یخی ترتیب کے ذریعے ممکن نہیں، بلکہ اسے اس عہد کے سماجی، سیاسی اور ادارہ جاتی دباؤ کے تناظر میں دیکھنا بھی ضروری ہے۔ صدیق سالک اپنے مشاہدات کی بنیاد پر مغربی پاکستان کے رویوں کو علیحدگی کے اصل سبب کے طور پر اجاگر کرتے ہیں۔ ان کے مطابق مشرقی پاکستانی عوام مخلص، معصوم اور پرامن تھے، جو انتشار یا فسادات سے بالکل دور تھے، لیکن مغربی پاکستانی حکمرانوں اور افسران کے رعونت بھرے، تحکمانہ اور حکمرانی کے انداز نے ان کی صبر و تحمل کی حد کو پار کر دیا۔ فوجی اور سول بیوروکریٹس نے مشرقی پاکستانیوں کے ساتھ غلاموں جیسا اور تحقیر آمیز سلوک اختیار کیا۔ اہم مقامی و سرکاری معاملات سے انہیں دور رکھا جاتا اور بالکل اہمیت نہ دی جاتی۔ درجہ چہارم کے ملازمین کو زیادہ ذلت اور حقارت کا سامنا کرنا پڑتا۔ بیوروکریٹس کے ان حاکمانہ رویوں نے نہ صرف ان کے جذبات کو مجروح کیا بلکہ مغربی پاکستانیوں کے خلاف نفرت کے بیج بھی بو دیے۔ اسی صورتِ حال کو بیان کرتے ہوئے مصنف لکھتے ہیں:

> "دراصل وہ بڑے محبت کرنے والے لوگ تھے، اگر میں یہ کہوں تو بے جا نہ ہوگا کہ وہ محبت کے پیاسے تھے، اگر ان کی محبت کا جواب محبت سے دیا جاتا، تو وہ بچھ جاتے تھے اور اگر ان سے رعونت اور بالادستی کا مظاہرہ کیا جاتا تو وہ بچھو بن جاتے تھے"۔(۸)

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

> "ان دو مشکل برسوں پر نظر ڈالتا ہوں تو نفرت، بعد اور علیحدگی کا ذمہ دار اپنے آپ کو اور اپنے مغربی پاکستانی ساتھیوں کو زیادہ گردانتا ہوں کیوں کہ اگر آپ بطور چیف سیکرٹری ان کو اپنے دفتر کے قریب پھٹکنے نہیں دیں گے، بطور ڈپٹی کمشنر انھیں پہروں برآمدے میں بٹھائے رکھیں گے یا بطور آرمی آفیسر ریل گاڑی سے ان کو اتار کر زبردستی اپنے مہمان سوار کروا دیں گے تو وہ یقیناً یہ سمجھنے میں حق بجانب ہوں گے کہ ہم نے 1947ء میں آزادی نہیں پائی، صرف آقا بدلے ہیں"۔(۹)

نوتار یخیت کے مطابق یہ بیانیہ اس بات کی عکاسی کرتا ہے کہ تار یخی واقعات اور علیحدگی کے اسباب محض سیاسی فیصلوں یا جنگی حالات سے نہیں بنتے، بلکہ سماجی تعلقات، طاقت کے ڈھانچے، ثقافتی رائے اور ادارہ جاتی رویے بھی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ صدیق سالک کی بیان کردہ یہ نفرت اور دوریاں درحقیقت ان کے ذاتی مشاہدات، فوجی تجربات اور مشرقی پاکستانی عوام کے ساتھ تعلقات کی عکاسی کرتی ہیں، جو تار یخی بیانیے میں عام طور پر پس منظر میں رہ جاتی ہیں۔ اسی طرح،

نوتاریخی تنقید یہ سمجھنے میں مدد دیتی ہے کہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی متعدد وجوہات تھیں۔ایک طرف سیاسی اور عسکری فیصلے،تو دوسری طرف غیر صحت مندانہ تعلقات اور معاشرتی رویے،جو ایک ہی ملک کے باشندوں کے درمیان فاصلے اور دوریاں پیدا کرنے کا سبب بنے۔صدیق سالک کا یہ بیانیہ اس پہلو پر بھی روشنی ڈالتا ہے کہ علیحدگی کی وجہ صرف سیاسی یا عسکری ناکامی نہیں تھی،بلکہ ذاتی اور سماجی تعاملات،پیشہ ورانہ ظلم وناانصافی،اور معاشرتی تفریق نے بھی اس میں ایک بنیادی اور اہم کردار ادا کیا۔نوتاریخی نقطۂ نظر کے مطابق اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ سیاسی و ملکی اتحاد اور ایک مضبوط نظام حکومت محض قوانین یا سرکاری فیصلوں سے نہیں بنتے،بلکہ عوامی تعاون،سماجی تعاملات اور ادارہ جاتی طاقت کے ڈھانچے بھی اس میں ایک اہم کردار ادا کرتے ہیں۔عوام کے ردعمل اور علیحدگی کے جذبات، جیسا کہ صدیق سالک بیان کرتے ہیں،اس دور کے سیاسی و سماجی پس منظر کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں اور مصنف کے ذاتی مشاہدات اور تعلقات نے اس بیانیے میں ایک واضح زاویۂ نظر بھی دیا ہے۔یوں مصنف کا یہ متن نہ صرف مشرقی پاکستان کے سیاسی و عسکری منظر نامے،بلکہ علیحدگی کے پس منظر کی ایک واضح اور تاریخی تصویر بھی پیش کرتا ہے۔علاوہ ازیں! طاقت،اختیار اور انسانی رویوں کے باہمی تعلق کو سمجھنے میں نوتاریخی مطالعے کے لیے ایک اہم حوالہ بھی فراہم کرتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔طاہرہ سرور،ڈاکٹر،عساکرِ پاکستان کی ادبی خدمات،اکادمیات،لاہور،۲۰۱۳،ص ۵۱۳

۲۔عتیق اللہ،پروفیسر،تعصبات،ایم آر پبلی کیشنز،نئی دلی،۲۰۰۵،ص ۱۲۰

۳۔4۔صدیق سالک،سلیوٹ،الفیصل ناشران،لاہور،۲۰۱۷،ص ۴۵

۴۔ایضاً۔۔۔ص ۴۷

۵۔ایضاً

۶۔ایضاً۔۔۔ص ۱۰۹

۷۔ایضاً۔۔۔ص ۱۱۰

۸۔ایضاً۔۔۔ص ۱۳۱

۹۔ایضاً